باب۱۴

بسم اللہ کے آٹھ طبق

امرِ بسم اللہ

چودھویں صدی میں امر بسم اللہ سے ''کُن'' کے ظہور کا پھر سے اُجالا ہے۔ پھر سے بسم اللہ کا رمز آشکار ہو رہا ہے۔ آدم کو ہی علم الاسماء کا مصداق ٹھہرایا۔ آدم ہی کو خلافتِ ارضی عطا کی گئی۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے تسخیر میں دیدیا گیا۔ مادی، جسمانی، ذہنی، قلبی، اخلاقی، وجدانی، روحانی، غرض ہر سطح پر بسم اللہ، امر اللہ مقرر ہوئی۔ بسم اللہ (ساتھ نام اللہ کے) کہہ کر گویا ارادے اور عمل کی میزان میں اللہ کے ساتھ عمل پیرا ہو رہے ہیں۔ ایک ہاتھ اس کا غیب میں، ایک ہاتھ ہمارا شہود میں، میدانِ عمل میں۔ اس طرح حق کی خوشنودی کی خاطر اس کی صفات کے اظہار کی اپنے اندر سے عمل پیرائی ہے۔ اس کی دی ہوئی صلاحیتوں کے عطیات کی اپنے اندر عمل پیرائی ہے۔ یہ صلاحیتیں ہماری جسم و جان و روح میں ودیعت ہیں۔ یہ جسمانی قوّت، ذہنی قوّت، قلبی قوّت، روحانی قوّت کی اپنے کردار میں رونمائی ہے۔ بسم اللہ بہ امر اللہ، اس کا زندہ ساتھ محسوس کرتے ہوئے اپنے وجود کے ہر طبق پر اس کی قدرتوں کی کارفرمائی ہے۔ وہ خود ہی فرما رہا ہے کہ ساتھ تو ہوں۔ ''ھُوَ مَعَکُمْ نَحْنُ اَقْرَبُ. فِیْ اَنْفُسِکُم'' (۱) اور جدھر رخ کرو اللہ ہی کا چہرہ ہے۔ (۲) ''فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللہ'' گویا۔ بہ برکتِ بسم اللہ ساتھ ''ھُوَ مَعَکُمْ شوق یَذْکُرُکُمْ فکر وعمل سَعْیُکُمْ'' صلاحیتیں اپنی قسمت میں عطا ہوئی تھیں ان

کے مطابق عمل پیرائی آسان کر دی گئی۔ اب ہمارے اعمال طیّب ہوئے۔ ایمان اور بھروسہ ان پر اور عمل ہمارا۔ مومن کو اس خیر و برکت کی وارفتگی میں اللہ کے نام سے عمل پیرائی کی لذت لینی ہے۔ میدان عمل کائناتِ شہود ہے۔ باطنِ وجود ہے، غیب ہے۔ ظاہر باطن ہماری دسترس میں ہیں۔ غیب ہمارے اختیار میں ہے۔ ملائکہ وہ قدرتیں ہیں جو اطاعت میں آ گئیں، ان سے کام لینا ہے۔ شیطنت وہ جو اس کے مخالف عمل پیرا ہو کر روگردانی کا سبب بنیں، ان کو ترک کرنا ہے۔ ان حق و باطل قدرتوں کا اظہار ہماری سعیٔ کردار میں ہے۔ اس میں سے اپنے اختیار، عقل و دانش، وجدان کے ذریعہ صراطِ مستقیم پر میزان قائم کرنی ہے۔ ہماری صلاحیّتِ تقدیر اس کی عطا کردہ ہے۔ لطافتِ تدبیر اپنی اختیار کردہ ہے۔ ان میں ایک ہم آہنگی، ایک کیف، ایک زوجیت، ایک وحدت، ایک وصل کی لذت لینی ہے۔

بسم اللہ کا لفظ اللہ اس حقیقت کا اظہار کیسے کرے جو ذات بے چون و بے نشان کی آئینہ دار ہو۔ اسم سوائے اس کے کس کی نشاندہی کرے جو خود حقیقت ہو۔ تو بسم اللہ کو پڑھ بھی لیا تو کیا۔ جب تک مُسمّٰی کی حقیقت کو نہ پایا تو کیا۔ اس لیے فرمایا۔ ''مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ''

بہ فیضانِ امر اللہ، بسم اللہ کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر دیکھیں تو جو صلاحیتیں ہمیں عطا ہوئی ہیں وہ بے تابِ عمل ہیں۔ انہیں ایک فطری رخ اس کُن کی بنا پر نصیب ہے۔ منشائے الٰہی کی نشاندہی خود ہمارا وجود کر رہا ہے۔ یہی کُن ہماری بنیادِ وجود کے تمام طبقوں پر چھایا ہے۔ عطیّاتِ الٰہی کے سازگار ہو جانے کا سبق یہ بسم اللہ دے رہی ہے۔ عبادت کا صحیح مفہوم، معبود کی صفات کو اپنانا ہے۔ خالق کے نام پر اپنے تمام عمل کا مخلوق کی طرف رخ ہے۔ اسی لیے

فقیر کا عمل، فقیر، کی دعا تک یہی ہوتی ہے کہ مقدرات کے ساتھ عمل پیرا ہو کر، اللہ کا ہاتھ بٹاتا ہے۔ دعا ہو یا بسم اللہ ہو یہ کہنے یا پڑھنے والی بات نہیں ہے بلکہ ہونے والی ہے۔ یہی ہر سطح کی عبادت ہے، یہی ہر سطح کا کُن، یہی عطائے رَبّی، منشائے الٰہی ہے۔ ہر شے اسی کی تسبیح میں ہے۔ کُن، یعنی ہو رہا ہے۔ ایک شدّتِ ظہورِ پیہم ''کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِیْ شَان'' ایک شدّتِ رونمائی، ایک شدّت تخلیق، ایک حُسن کا نکھار۔ اسی کی شگفتگی ہمارا جسم، عقل، حواس، جذبات اسی کا عروج ہمارا قلب، روح، سِرّ، خفی، اخفا، غیب۔

یہ مادی دنیا، یہ نفس کی سطح کا فروغ، یہ جمعیت بندی کے نئے تقاضے اسی کُن کا اظہار ہیں۔ ان کے پیچھے وہی تب و تابِ شرر، وہی اظہار کی تڑپ، وہی جلوہ نمائی کی بے چینی، وہی سوزِ دروں سے بے حجاب ہو جانے کی بے ساختگی، جو حسنِ مجرد کو ازل میں تھی۔ مادیّت کے پردے ''ظلوماً جھولاً'' ہیں۔ مگر اس کے پیچھے ''لاتَقْنَطُوْا مِنْ رَحْمَتِ اللہ'' کی پکار ہے۔ فَاغْفِرْلِی کی شہنائی، سازو آواز کی ہم آہنگی، زیست کے راگ کی اٹھان ہے۔ ''اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ اور قَالُوْا بَلٰی'' کی اویسی ملاقات، نگاہِ بے محابا کی انجان خواہش ہے۔ چونکی چونکی سی معصومیت، آدم کا نکھار، ربوبیت کی بہار ہے۔ جب بہ برکتِ بسم اللہ منزل درمنزل حجابات اٹھے تو فطرتِ انسانی کے انوار، نفس ۱، لطیفۂ نفس ۲، قلب ۳، روح ۴، سِر ۵، خفی ۶، اخفا ۷، غیب ۸، آٹھ طبق پر پھیلے بسم اللہ کے یہ آٹھ طبق اپنے ہی اندر کُن کے ظہور کی منازل بنے۔ یہ منازل کی ترتیب اور حد بندی بھی صرف شعور کی رسائی کے لیے ہوئیں۔ وگرنہ بسم اللہ خود واحد، ایک توحیدی رنگ میں تمام منازل میں جاری و ساری ہے۔ ان تمام منازل کا کمال عبودیت ہے۔ اس لیے عبودیّت، اعلیٰ ترین مقام ہے۔ عبودیّت کے مقام پر

بسم اللہ کا کُلّی نفاذ ہے۔ یہ حقیقی وصال اور توحید کا رنگ ہے جہاں کہا جا سکے کہ من وساقی بہم سازیم۔ یہ وہ اچھوتی سادگی ہے۔ نہ تیرے بغیر مَیں، نہ میرے بغیر تُو، یہاں دوئی عقل کا فتور ہے۔ عشق کی یکتائی دو جہاں کا نور ہے۔ نہ بسم اللہ کی اپنے سے علیحدہ کوئی حقیقت ہے، نہ اپنے کو بذات خود بسم اللہ کہنے کی طاقت ہے۔ یہ دونوں تو ایک دوسرے کے لازم وملزوم ہیں۔ زوجین کی طرح ایک ہی مقناطیس کے دو قطب ہیں۔ اکیلے نہ ان کی حقیقت ہے، نہ فہم و ادراک۔ صرف تنہا نہ ان کا عملی اطلاق ہے، نہ توحیدی ظہور۔ وجود تو علیحدہ، معنویت تک میں نہ ان کے معنی، نہ شعور۔ البتہ زوجین کے انداز میں رجوع الی المحبوب۔ جیسے آزاد لنگانے پر مقناطیس ایک ہی رخ اختیار کر لے۔ اس کے ذرّہ ذرّہ کی صلاحیت، وجود کے ہر طبق کے جامعیت میں یک رخی ہو۔ وہی ''اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن'' والی بات یہی عشق کی انتہا ہے، یہی عبدیت کا مدّعا ہے۔ اور ہر سطح کی بسم اللہ کا یہی جامعیت کا انداز ہے کہ اس سطح کی ساری صلاحیتوں کو یک رخی اور شدّت انہماک۔ یوں کائنات میں جتنے بھی ظہور ہیں سب انسان میں موجود ہیں۔ ملائکہ یعنی حق کی قدرتیں، حوروغلمان یعنی لطافتیں، سب کی محویّت اپنی انفرادیت سے وابستہ ہے۔ گویا جیسی روح ویسے فرشتے۔ اس لیے جب تک اپنے میں صلاحیّت نہ ہو ان قدرتوں، ان لطافتوں کا اظہار اپنے میں کیسے دیکھے۔ یوں لاکھ بسم اللہ پڑھے جب تک اپنے میں اظہار نہ ہو، ان حقیقتوں کو کیسے پائے۔ عشق ہی کی بدولت اپنی استعدادیں جاگتی ہیں۔ عشق ہی مقناطیس کے قطب کو مقناطا ہے۔ نئی شدّتِ حیات عطا کرتا ہے۔ من و ساقی بہم سازیم کے مقام سے حیُّ میں زندگی عطا کرتا ہے۔ قیّومُ میں قیام، زوجین کو وصلِ دوام۔ اس کی میثاق اَلَسْتُ بِرَبِّکُم، اس کی زوج قَالُو بَلٰی۔

یہ اپنے ارادے اور اختیار اپنی عقل و دانش سے پرے تجلّی ذات ہے۔ظہورِ ذات بہ پردۂ صفات ہے۔ کُن کی کارفرمائی پسِ پردۂ فَیکُون ہے۔ کُن وہی تجلی کا کڑکا ہے جس نے چودہ سو سال پہلے عرب کی سرزمیں کو ہلا دیا۔ وہی حیاتِ ثانیہ جو حضرت عبدالقادر جیلانیؒ نے بہ واسطہ باطنِ اُمّت کو عطا کی اور محی الدین کہلائے۔ بسم اللہ وہی انوار، جن کی تابانی بار بار ہادیانِ قوم نے اُمّت کو عطا کی۔ اب اس بسم اللہ کی پھر سے کارفرمائی اگر اپنے وجودوں میں چند ایک پالیں تو بقیہ گروہِ اُمّت صرف سن کر بھی یہ یقین اور خود اعتمادی کسی نہ کسی حد تک حاصل کر سکے گا۔ کیونکہ اسی قسم کا یقینِ صدیقی حاصل ہو جانے کی مثالیں تاریخ میں موجود ہیں۔ البتہ یہ یقین صرف زبان کے اقرار اور عقل کی سطح کا نہیں ہے، جس کا پرچار زور شور سے علمائے ظواہر کر رہے ہیں۔ یہ یقینِ باطن اتنی ثبت چیز ہے جیسا کہ اپنا وجود۔ جیسے کہ ہماری عینِ حقیقت۔

قوم فی زمانہ ابتلا میں ضرور ہے مگر اس کی نِشاۃِ ثانیہ کے لیے مسئلہ طلب بات یہی ہے کہ بسم اللہ کے مفہوم، بسم اللہ کے عملی پہلو کا نزول کسی طرح قلوب میں کرا دیا جائے۔ اتنا ضرور ہے کہ بسم اللہ کے امر اور اذن کا راز بسم اللہ ہی میں ہے۔ اور مقناطیس کے دوسرے قطب کی طرح بغیر ہمارے وجود کے دخل کے اس عمل کی راہ نہیں کھلتی۔ اس لیے ہر فرد کو اپنی زندگی کی اہمیت کا اندازہ کرنا ہے اور اپنے اندر جو وصالِ محبوب کی جھلک ہے اس پر یقین رکھتے ہوئے، اسی عشق و محبت و ایمان کی بے ساختگی میں بسم اللہ کا عمل دیکھنا ہے۔ عارفین جو زندگی کا نچوڑ دیتے ہیں وہ یہی بسم اللہ ہے۔ کیونکہ ''بِسْمِ اللهِ مِن عَارِفٍ بِاللهِ كُكُنْ مِّنْ اللهِ'' (عارف باللہ کی بسم اللہ اللہ کا کُن ہے۔) پیر کامل یا حادی، راہبری بھی کرتا ہے اور دستگیری بھی۔ مگر آخر کو تو سب کچھ حُسنِ عمل،

اپنے ہی وجود پر منحصر ہے۔ زندگی کی وجہ سے ہمارے جسم کی تابندگی ہے اور جسم کی وجہ سے فروغِ عمل ہے اور زندگی میں تابانی۔ فروغِ عمل کے پیچھے وہی کُن۔ کُن کہنے سے پہلے خواہش، خواہش کا سبب حُب۔ حُب کا مرکز حُسنِ مجرد۔ حُب کی شدّت میں کُن اس نے کہا اور ''بِسْمِ اللّٰہِ مَجْرٖھَا وَ مُرْسٰھَا اِنَّ رَبِّیَ الْغَفُوْرٌ رَّحِیْم'' کہہ کر جادہ ہستی پر گامزن ہم ہوئے۔ یہی کچھ عارف باللہ کی بسم اللہ کی بات ہے۔ اور یہ بات بنتی ہے ایمان سے۔ وصالِ محبوب سے ظاہر باطن کی توحید ہے۔ باطن کا جاگنا اسی امر بسم اللہ سے ہے۔ ذکرِ خفی اسی امر کے طفیل دو دھاری تلوار بن جاتا ہے کہ ظاہر کے وہم و گمان اور خواہشوں اور اقتدار کے بُتوں کی ''لا'' ہوتی ہے اور باطن کے پردے بھی چاک ہوتے ہیں۔ اس طرح باطنی صلاحیتیں مصروفِ عمل ہونے لگتی ہیں۔ قلب میں عشق کی قندیل روشن ہو جاتی ہے۔ پھر اپنے ہی حُسنِ باطن میں حق کی قدرتوں کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ اسی لیے جب عقلِ سلیم اور قلب و روح اس امرِ بسم اللہ کے معنی اور ان کی جان پکڑیں تب یہی اسمِ اعظم ہو جاتا ہے۔

ملتِ اسلامیہ صدیوں سے ایک مُردہ کیفیت میں زندگی گذار رہی ہے۔ حیاتِ نو کے لیے اس جسم و حواس اور عقلِ ظاہر تک کو خوابِ غفلت سے جگانا ہے۔ آخر مقصدِ زندگی کچھ تو ہوتا ہے کہ اپنے وجود کی تھوڑی بہت صلاحیتوں ہی کو بروئے کار لا کر یہ قوم کچھ تو شکرانۂ بندگی ادا کرنا سیکھے۔ کچھ غیرتِ دین اور عشقِ نبیؐ اس قوم میں جاگے کہ روٹی اور کھانے اور خواہشاتِ نفس سے بالاتر ہو کر، اعلیٰ اقدارِ زندگی کی طرف بھی رجوع ہو۔ علاقائی اور لسانی تنگ نظری سے اس کی گلو خلاصی ہو۔ یہ تو یقینی بات ہے کہ قومی زندگی کا احساس ہی انفرادیت کے دائرے سے انسان کو نکال سکتا ہے اور جمعیت کی

زندگی میں بھی شدّت اسی وقت آ سکتی ہے جب اس کے لیے کوئی نصب العین قطعی کلّی تعیّن کے ساتھ ہو۔ قومی زندگی کا مقصد فرد کی زندگی کے ساتھ وابستہ ہو۔ از طفیلِ ''رَحْمَتَ اِلّلعَالَمِیْن'' عشق جاگے۔ مرکزِ عشق سے قرب و وصال نصیب ہو تو شدّت حیات نصیب ہو۔ رجوع الی المحبوب ہی اپنی صلاحیتوں کو بیدار کر سکتا ہے۔ تشفی عطا کر سکتا ہے۔ جس کے وجود سے تشفی ہو وہ ذات ''رَحْمَتَ اِلّلعَالَمِیْن'' ہے۔ تشفی مل جانا ہی شفاعت ہے۔ شفاعت کی محرک قوت کُن کے سہارے ہی اعمال میں صداقت اور حیات آتی ہے۔ ایمان مستحکم ہوا تو اس ایمان کی روشنی نے دوسروں میں بھی نئی امنگیں، ولولے اور جوش بیدار کیے۔ اب اُمّت کو نفس کی سطح سے بلند ہو کر، یار پر نظر رکھنی ہے۔ اب ضرورت ہے کہ روشن شمع کے گرد پروانے جمع ہوں کیونکہ شمع نہ ہو تو اندھیرا۔ یار کی روح کو ہٹا دیجئے تو بیکار زندگی یوں مشہور بات ہے کہ حضورﷺ کا دیدار ڈھائی لاکھ رُوپوں میں لوگوں کو ہوا ہے۔ سوا لاکھ پیغمبر اور سوا لاکھ ولی۔ انہی انوار میں اس نورِ حقیقت کو پائیں۔ ذات کی طلب بے معنی ہے۔ محبت کی شدّت، ایمان کی لذت میں، کُلّی بھروسے کے ساتھ ذاتِ محبوب کو اپنائیں تو ارتقائے باطن کی راہ کھلے۔ انوارِ محمدیﷺ کی آئینہ داری ہو۔ جہان میں یہ انوار پھیلے ہیں۔ شمسِ حقیقت ایک ہی ہیں۔ ''لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتَ الْاَفْلَاک'' اپنی کوربینی سے شمسِ حقیقت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اسی شمسِ حقیقت کی تجلّی کہیں سے ملے تب آ سکے بعد کہیں کُنْ فَیَکُوْن کی کارفرمائی اپنے باطنِ وجود میں ہو سکتی ہے۔ یہ کُن کچھ ایسا ہے کہ جیسے کائنات بننے اور پھیلنے کی مثال ہے۔ کہتے ہیں پلازما قسم کا ایندھن ایٹموں کی درمیانی جگہ میں تھا۔ اور ان سب نے ایک مختصر سی جگہ گھیر رکھی تھی۔ پھر جب پلازما، ان ایٹموں کی

درمیانی جگہ میں بھرا جا چکا اور کُن کا دھماکہ ہوا، تو یہ پھٹا اور پھیلنا شروع ہوا۔ اور زمان مکان میں کُن ایک جاری ساری حقیقت بن گئی۔ اس مثال کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر فرد و اُمّت کے قلب و روح کی درمیانی جگہوں میں شفاعت کا پلازما بھر دیا جائے تو پھر بسم اللہ، امرِ کُن سے ظہورِ رحمت ہوگا۔ کُنْ فَیَکُوْن سے پہلے محبت کا لگاؤ۔ اسی سرچشمۂ رحمت و شفاعت سے اُمّت میں آنا ہے جو ''رَحْمَتَ اِلّلعَالَمِیْن'' ہے۔ جمعیت ہی سے یہ کام بن سکے گا۔ کیونکہ انفرادی حیثیت تک اگر یہ حاصل بھی ہے تو اس سے کام نہیں بن رہا۔ مادی دنیا تک میں جمعیت بندی ہی سے زمانے نے فائدے اٹھائے ہیں۔ جمعیت بندی ہی باطن کی راہ سے عملِ بسم اللہ کے اس کُن کی اہل ہو سکے گی جسے بجلی کا کڑکا کہا جا سکتا ہے۔ وصلِ محبوب رب العالمین ہی سے مومن کے مقام کی ابتداء ہوتی ہے یہی شفاعت کا پلازما ہے، یہی اس کے قلب کا نور ہے۔ یہی اس کا تقویٰ، یہی اس کی بسم اللہ۔ اس کے ذریعہ وہ کلامِ محبوب سے آشنا ہو سکتا ہے۔ ایک محبت والا ہی پیامِ محبوب کی قدر کر سکتا ہے۔ کلام بھی اس پر اپنے رموز آشکار کرے گا جس کی محبوب سے نسبت ہو۔ ''اِقْرَا بِاسْمِ رَبِّکَ'' پڑھ اپنے رب کے نام کے ساتھ۔ یہ پیامِ کُن، خبر ہے، رہنمائی ہے۔ مَیں اور تُو کے درمیان اشتراکِ عمل ہے۔ حضرت آدم کو اسماء سکھا کر فرشتوں پر فوقیت دی گئی۔ اس علم کے پیچھے بہم سازیم، کی دلربائی ہے، حقیقت کی رونمائی ہے، باطن کی پرکشائی ہے، بسم اللہ کی عمل پیرائی ہے، نفس، قلب، روح کی تمام باطنی صلاحیتیں بروئے کار لا کر ہر سطح کے عمل کی ذمہ داری ہے۔ اس بسم اللہ کے طفیل، علم و دانش، ہنر اور عمل کو نیا فروغ ہے۔ امرِ بسم اللہ کے لیے ربوبیتِ شیخ کی ضرورت ہے، کہ دامنِ شفقت میں نفس سے لطیفۂ نفس کی منزل پر پہنچنا نصیب ہو۔ عشق کے

طفیل صلاحیتِ قلب عطا ہو۔ امرِ ربّی کے ذریعہ روح کی بیداری اور رحمت کے وسیلے سے اعلیٰ مقامات یعنی سر، خفی، اخفا، غیب تک رسائی ممکن ہو سکے۔ یہ بسم اللہ کے آٹھ طبق اپنی اپنی سطح کے عملی میدان ہیں۔ عمل کا تعلق صرف ہاتھ پاؤں ہلانے یا دماغ کی کارفرمائی تک ہی محدود نہیں ہے، قلب کی سطح پر عمل کی کارفرمائی عشق کی صورت میں ہے۔ روح کے مقام پر امرِ ربّی کے سہارے سے اور آگے کی منازل سر، خفی، اخفا، غیب میں رحمت کے وسیلوں سے ہے۔ شفقتِ شیخ میں عشق، امر اور رحمت کی بات یہ ہے کہ بسم اللہ کی پہلی ٹھوکر سے چوتھے آسمان پر پہنچے۔ عشق میں قیام پائے، اَنَا رُوْحِی پکار اٹھے۔ کُنْ فَیَکُوْن کی دوسری ٹھوکر سے ساتویں آسمان پہنچے۔ نور کا پردہ حائل ہے۔ جبرئیل غیب سے پیغام لاتے ہیں۔ جبرئیل، روح الامین، نفسِ جبرئیل، دمِ عیسیٰ، جبرئیل کو اگر سینچیں تو بہ برکتِ بسم اللہ ''کُنْ فَیَکُوْن'' کی چابی مل سکتی ہے۔ سینچنا کیا ہے۔ یاد کی شدّت ہے، شدّتِ ذکر میں دَم۔ اور ٹھنڈی سانس آہ کی چھوڑنا ہے اسی یاد میں۔ یہ آبِ حیات بھی ہے اور آگ بھی۔ کھینچ کھینچ کر جب سینہ سمندر ہوگیا تب کہیں اس پار یعنی غیب پر فتح ہو سکتی ہے۔ جبرئیل غیب سے پیغام لاتے ہیں۔ تیسری ٹھوکر اسمِ ذات کی ہے۔ غیب کی فتح ہے اور یہی اسمِ اعظم ہے۔ اسمِ اعظم وہی ہے جو دل میں بسا ہو۔ ٹھوکر پر کامل کے اختیار کی بات ہے اور وہ بے پردہ ہے۔ ''اَللّٰہُ اَحَدٌ اَللّٰہُ الصَّمَدُ''

قوی سطح پر اسلام کے فروغ کی ان باطنی محرک قوتوں کو قلوب ہی سے چشموں کی طرح ابلنا ہے۔ مادی سطح پر فروغِ انسانی کو لیں، عالمِ انسانیت اس سے مستفیض ہو رہی ہے۔ مگر قلوب کا پھٹ پڑنا سب کے نصیب میں نہیں۔ قلوب کا کھلنا تو وہ کیفیت ہے کہ ادراک و عقل اس کی فہم سے عاجز ہیں۔

ادراک و عقل صرف اسکی لذت لے سکتے ہیں۔ اور اسی کے سہارے عمل اور زندگی کو رخ دے سکتے ہیں۔ دل روشن ہونے، باطن کی کھڑکی کھلنے کا تعلق عشق سے ہے۔ ایمان اسی عشق کا لازمی جزو ہے۔ ایمان بغیر عمل کے بے معنی بات ہے۔ قرآن کریم میں ایمان ان ہی معنوں میں ارشاد ہوا ہے۔ عمل کی توفیق الٰہی انسان کے باطن میں عطا ہوئی ہے۔ جیسے جیسے نفس کی منزل سے اٹھتے جائیں اس میں اور شدّت آ جاتی ہے۔ البتہ طریقۂ کار ہاتھ پاؤں کے عمل سے مختلف ہے۔ انسان کے باطن ہی میں نورِ عقل کا سرچشمہ ہے، الحیات و الحیوان کا ادراک ہے۔ یہ ادراک ایک مستی و سرشاری کے انداز میں ہے۔ یہیں وحدتُ الوجود کی لذّت ہے یعنی آخری منتہائے وجود کا کیف ہے۔ وحدتُ الوجود کی ایک کثیف سی مثال وہ مٹی ہے جس سے بہت سے مختلف شکلوں کے برتن بنتے ہیں۔ مٹی سب کی ایک، بنیادِ وجود سب کی ایک، اس سے آگے رحمت کے وسیلوں سے نسبت ہے۔ البتہ عبدیّت کا انداز، بسم اللہ کو توحیدی رنگ میں تمام طبقاتِ نفس، قلب، روح میں اپنانا ہے۔ فطرت کی تمام قوتوں کو، توحیدی میزان میں اپنانا، ایک ہی عظیم ہستی، ایک ہی انسانِ کامل کی لیے ہو سکتا تھا۔ جو خود وجود میں ہو۔ ﷺ۔ طالبِ حقیقت جب بہ طفیلِ نسبتِ محمدی ﷺ، ذات اور اس کی قدرتیں اپنے وجود میں سمو لیتا ہے، تو پھر باطنِ عالم میں ان کے نشر کرنے کا ذریعہ بھی اسی کا وجود ہو جاتا ہے۔ حرمِ دل میں اذان دینا اور قلوب میں تبلیغ کرنا، اسلام کی ایک اعلیٰ حقیقت ہے۔ اسی کے سہارے باطنِ اُمّت کو سنوارنا ہے۔ تزکیۂ باطن کرنا ہے۔ ''رَحْمَتَ اللِّلعَالَمِیْنی'' کے طفیل ہی قلوبِ انسانیت میں فروغ و حیات کے چشمے پھوٹیں گے۔ وہی ﷺ صاحبِ تاج و معراج و براق و علَم ہیں۔ وہی ﷺ دافعِ بلاء و وباؤ قحط و مرض و الم ہیں۔ رحمت

کی ایک ہوا ایسی چلے گی، جو تخیلِ انسانیت، قلوبِ انسانیت، عملِ انسانیت کو حق کی طرف یک رخی بخشے گی۔ اس فروغِ باطن کے لیے بس محبت و رحمت، دل سے نشر کرنی ہوگی۔ یا یوں کہ لیں کہ فطری محبت و رحمت کے تاروں کو جب چھیڑا جائے گا تو قلوبِ انسانیت کے تار بھی اس سے ہم آہنگ ہو کر ایک نغمہ سا بن کر پھیل جائیں گے۔ یہ ہیں بسم اللہ کے وہ انوار، جو باطنِ وجودِ اُمت سے اٹھ کر ارض و سماء زمین اور سات آسمان یعنی آٹھوں طبقاتِ جسم و روح پر جاری ساری ہوں گے۔

پہلا طبق:

بسم اللہ کا پہلا طبق نفس کی سطح ہے۔ یہاں ولولہ ہے، جوش ہے، انہماکِ کار، زندگی کے احسان کا شکرانہ بندگی ہے۔ جان و جسم کی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر زندگی اور حیاتِ انسانی کو جلا بھی دینی ہے اور دوام بھی بخشنا ہے۔ ایک سطحی جائزہ لیا جائے تو ''کُن'' وہ فطری محرکِ قوتِ عمل ہے جو قدرت نے مزاج کائنات میں ودیعت کی ہے۔ کیا جمادات نباتات کیا حیوانات، انسانی زندگی میں اس کی کارفرمائی تولید، نشوونما، حیات، ارتقاء کے پہلو لیے ہے۔ اور جس طرح کی زندگی انسان گذار رہا ہوتا ہے اسی سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔ یعنی لطیفۂ نفس، قلب، روح اور اعلیٰ مدارجِ روح، امر، سر، خفی، اخفاء غیب۔ اولادِ آدم ہونے کی حیثیت سے عام انسان کو کم از کم نفس کی سطح کی تو زندگی گذارنی ہے۔ فطری محرکِ قوتِ کُن کے زیرِ اثر اس کی مادی صلاحیتوں کو، جو اس کے مقدر میں ہیں، عمل پیرا ہونا ہے۔ مگر انسان ظالم بھی ہے جاہل بھی، سست بھی ہے گمراہ بھی۔ عمل کرنے نہ کرنے پر جو اسے اختیار ملا ہوا ہے، اچھے

بُرے کی تمیز جو اس میں ودیعت ہے، اسے بسا اوقات جانوروں کے مقابلہ میں بھی سست بنا دیتی ہے۔ کبھی وہ اپنی مجبوری، کم عملی، بے عملی کے بہت سے بہانے تراش لیتا ہے اور کبھی اپنی خود ساختہ جہالت کے باعث عام تہذیب یافتہ زندگی تک گذارنے کا اپنے کو اہل نہیں بناتا۔ اس کے مقابلے میں ایک حقیر جاندار شہد کی مکھی کی ہی مثال لیں کہ وہ اپنی تمام زندگی کیسے انہماک، کیسی تنظیم، کیسی جانفشانی میں مصروفِ عمل رہ کر گذارتی ہے اور نسلاً بعد نسلاً یہی مفید، اجتمائی زندگی کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اس کی فطری عمل کے راہ میں نہ اختیار رکاوٹ بنتا ہے، نہ فیصلہ۔ انسان اشرف المخلوقات ہونے کی وجہ سے یہ اختیار اور فضیلت رکھتا ہے کہ اسے کیسی اعلیٰ سطحیں اور ان کا ذکر، نفس کی مادی سطح تک بھی جانوروں کے مقابلہ میں کہیں احسن طریقے سے گذارنے کی صلاحیتیں ودیعت ہیں۔ اس زندگی کو احسن تر اور شدید تر گذارنے کے لیے عقل وتوانائی، فکر وتدبر، جوش اور انہماکِ کار نصیب ہے۔ عام حیوانی زندگی، انفرادی یا اجتمائی سطح پر اور بلند کرنے کے لیے ہمدردی، جذبۂ خدمت، اخلاقِ حسنہ کی منازل نصیب ہیں۔ جنہیں لطیفۂ نفس کہہ لیں۔ پھر کسی مرکزیت سے عشق کے طفیل اسے اور بھی والہانہ شدّتِ عمل کا اختیار ملا ہے جسے حُب کی منزل کہہ لیں۔ اس سے اور آگے خلیفتہ اللہ ہونے کی حیثیت سے مقامِ امر میں بھی دسترس حاصل ہے۔ جسے مقامِ روح اور اعلیٰ مدراج کہہ لیں۔ گویا انسان کے عروج کی کوئی انتہا نہیں۔ جانوروں کو نفس کی سطح سے اوپر زندگی گذارنے کی نہ صلاحیت ملی ہے نہ اختیار۔ انسان اگر سستی اور جہل میں مبتلا ہے تو جانوروں سے کم تر ہے اور اگر اپنے اعلیٰ مقامات کو حاصل کر کے زندگی گذارنے لگا تو فرشتوں سے افضل ہے۔

آج عام انسان کی زندگی کو دیکھا جائے تو وہ کچھ ایسی ہی سطح پر گذر رہی ہے کہ اوپر کے مقامات کا نہ اسے شعور ہے، نہ احساس۔ اسے اس کے مقام سے آشنا کرانے کی کوشش کی جائے تو وہ اسے صرف ذہنی عیاشی اور پروازِ تخیل ہی سمجھے گا۔ آج اس کی زندگی میں نفرت کا جذبہ تو آسانی سے ابھر آتا ہے جس کی بنا پر وہ جماعت بندی کر لیتا ہے۔ اپنی جان بھی دیدیتا ہے۔ مگر وہ محبت اور عشق کے جذبے کے تحت توحیدِ عمل، اس کی زندگی میں مفقود ہے۔ نہ اس کی زندگی میں وہ محبت کی معصومی، بے ساختگی اور والہانہ پن ہے، نہ خون پسینہ ایک کر کے محبوب کے نام پر عمل پیرا رہنا یا قربان ہو جانا ہے۔ بات بس نیت کے فرق کی ہے۔ مقامِ نفس والا اپنے لیے سب کچھ کرتا ہے اور مقامِ قلب والا اپنے محبوب کے لیے۔ جب مقامِ قلب تک نصیب نہیں تو مقامِ روح کی کیا بات کی جائے۔ کہ جہاں کی ابتداء محبوب کے ساتھ یکتائی کی ہے، جہاں یار اور اپنی مرضی ایک ہے، مقامِ امر ہے، محبوبیت کا انداز ہے۔ جہاں ہدایت مِن جَانِبِ اللہ، القاء ہوتی ہے۔ یہ سب عروج یعنی اپنے باطن کے جاگ جانے کی بات ہے۔ اپنی پوشیدہ خوابیدہ صلاحیتوں کے بیدار ہونے کی بات ہے۔ حق کے سب کچھ انوار اسی انسان کی فطرت میں پوشیدہ ہیں۔ حق کی سب قدرتیں اس کے مقدر میں ملی ہیں۔ انہیں کے سہارے اس کارزارِ عالم میں عمل پیرا ہونا ہے۔ یہ ہے کُن کا راز۔ یہ ہیں ہر سطح کی بسم اللہ کے انوار۔

نفس کی سطح کو لیں تو اپنی مادّی جسمانی اور ذہنی قوتوں کا کچھ کچھ انسان کو شعور ہے۔ ان قوتوں سے ہی حسبِ مقدرت کام لے تو کیا کچھ نہیں کر سکتا۔ ان قوتوں کی کارفرمائی اپنے اندر دیکھے تو کُن کی لذت سے آشنا ہو۔ مگر ان صلاحیتوں تک کا استعمال، جن کا تعلق صرف مادی جسم و ذہن سے ہے،

انسان نے کم ہی کیا ہے۔ نہ اپنی زندگی کی قدر کی ہے، نہ اپنی صلاحیتوں کی، نہ اپنے مقام کو سمجھا ہے، نہ اپنی نسبتِ حق کو۔قدرت کی عطا کردہ وہ محرک کُن کو اپنے اندر کارفرما ہوتے دیکھ کر، اسی محرک قوت کو زندگی کا چراغ بنا لے تو اپنی انفرادی زندگی تک میں اپنے زورِ عمل اور زندہ رہنے کا ثبوت مل جائے۔ وگرنہ عام حیوانوں کی طرح جیئے جانا تو آخر کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس نفس کی سطح کی عبادت بھی تو یہی ہوسکتی ہے کہ اپنی انفرادی صلاحیتوں کو پہچان کر، ان کی تربیت دے کر، ان کو برسرِ عمل لا کر اپنی زندگی بھی بہتر کرے اور دوسری مخلوق کی بھی۔

انسان کی طبعاً غفلت اور سُست مزاجی کا تدارک کچھ اسی طرح ہوتا ہے کہ راہ چل کر اسے راہ بتائی جائے۔ یہی کام **مُصلحین** اور **ہادیان** کا رہا ہے۔ ہر مقام کے انسان کو اس کی فطری صلاحیتوں کے مطابق عمل پیرا کراتے ہوئے اسے اوپر کی منازل تک اٹھانے کی کوششیں کی گئی ہیں۔نفس کے مقام پر افراد کو عمل پیرا کرانے کے لیے ایک مقصد، ایک مفید نصب العین دے کر انہیں مصروفِ زندگی کر دیا گیا ہے۔ پھر جب ان کے نفس کو اجتماعی زندگی میں اخلاقِ حسنہ کے ذریعہ تربیت مل چکی تو زندگی میں اور شدّت لانے کے لیے ان کے اندر عشق ومحبت کا چراغ روشن کرا دیا، کہ محبوب سے لگاؤ ایک سست مزاج کو بھی والہانہ پن عطا کر دیتا ہے۔ اور محبوب کے ناموس کی خاطر وہ کیا کچھ نہیں کر گذرتا۔ زندگی کو بامعنی بنانے کے لیے ایک چیلنج، ایک مہم کی ضرورت ہے جسے سر کرنا ہو۔ ایک مقصد، ایک تازیانے کی ضرورت ہے جو خوابیدہ صلاحیتوں کو بروئے کار لائے۔ زندگی اور عمل میں دلچسپی پیدا کرے،عمل کی کاوش، جینے کی خواہش، مادّی اسباب کی ضرورت سے آشنا کرے۔ جن مشاہیر نے زمانے کو

ایک رخ دیا انہوں نے بسم اللہ کی اس سطح پر عمل پیرائی کی۔ انہوں نے ایک نصب العین زمانہ کو دیا۔ جس کی بنا پر ولولہ، جوش اور انہماکِ کار قوموں کو نصیب ہوا۔ افراد کی باطنی صلاحیتیں بروئے کار آئیں۔

مختصراً نفس کی سطح پر بسم اللہ کی کارفرمائی، ایک تب و تابِ شرر، اظہار کی تڑپ جلوہ نمائی کی بے چینی ہے۔ اس سطح پر جسم، حواس، عقل کی کارفرمائی ہے۔ عقلِ ظاہر مشعلِ راہ ہے۔ اور دائرہ عمل مادی دنیا۔ نفس کی ضروریات پوری کرنے کی خاطر دعوتِ عمل ہے۔ ان ہی کی طلب میں فطری صلاحیتیں مصروفِ عمل ہیں۔ تسکینِ نفس مقصودِ نظر ہے۔ اسی کی خاطر جسم وحواس وعقل کی صلاحیتوں میں فروغِ کُن ہے۔ سوزِ دروں سے بے حجاب ہونے کی بے ساختگی ہے۔ ہر عمل کی محرک اور پوشیدہ صلاحیتِ کُن ایک جاری چیز ہے۔ فطرت کی اس عمل پیرائی کا اپنے اندر کیف ملے تو احساس یہی ہوتا ہے۔ کہ یہ کام مجھ سے کروایا جا رہا ہے۔ میں صرف آلہِ کار ہوں۔ اس طرح اللہ کی مشیت پر عمل پیرائی ہے۔ مقدّر یعنی حدِ امکان کے مطابق عمل پیرائی سہل ہے۔ اسی لیے اعمال طیّب ہیں۔ اس عطائے الٰہی کا احسان عمل کے ذریعہ ہی ادا ہو سکتا ہے۔ گویا شکرانہِ بندگی لذّتِ عمل اور جذبۂ انہماک اور اجتمائی فروغ کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔ جادۂ ہستی پر گامزن ہو کر آدم اپنے عروج کی تلاش میں نکلا۔ ''رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا'' پکار اٹھا۔ کیونکہ نفس اگر کمزور ہوا تو لذّتوں کا تابع ہوا۔ راہ کھوٹی ہوئی اور اگر اس کو چھٹکارا اور مغفرت نصیب ہوئی تو اپنے کمال کو پہنچا۔ لطیفۂ نفس میں قدم رکھا۔ نفس کی بندشوں سے نجات میں آدم کو نکھار ملا۔ ربوبیت کی بہار آئی اور وہ میکائیل کا شہسوار بنا۔ اب اپنے میں سے ربوبیت کی صلاحیتوں کا فروغِ کُن ہے۔ بسم اللہ صرف افراد کی حد تک کی بات نہیں۔

انفرادی حد تک جن لوگوں نے تن دہی سے اپنی جسمانی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی کوشش کی، انہوں نے اپنی محدود زندگی کی حد تک فائدہ اٹھایا۔ دوسروں کے مقابلے میں سرفراز رہے۔ مگر یہ نفسانفسی کی خودغرضی کی حد تھی۔ البتہ اس بسم اللہ کا رخ جب جمعیت کی جانب ہوا تو بات ہی دوسری بننے لگی۔ مقصدِ زندگی کو جمعیت میں حیات ملی۔ جمعیت کے لیے مرکزیت کی ضرورت تھی۔ مرکزِ جمعیت سے یک رخی قائم ہو کر تخیل کی رعنائی ملی۔ یکتائیتِ عمل پیرائی ہوئی۔ اب ''مِن حیث القوم'' دوسری قوموں پر فضیلت نصیب ہوئی۔ اجتماعی، جسمانی، ذہنی طاقتوں کی شدّت ہوئی۔ جمعیت اپنی فلاح کی خاطر، اپنے دوام کی خاطر پھلی پھولی۔ کامیابی پر کامیابی ہوئی جن قوموں نے عمل کی ضرورت کو اپنا لیا، اپنے حدِ امکانِ عمل کو پا لیا انہیں مادی دنیا میں فروغ ہے۔ باوجود اس کے کہ وہ کُن کی لذت سے نا آشنا ہیں۔

دوسرا طبق:

بسم اللہ کا دوسرا طبق لطیفۂ نفس ہے۔ یہاں انہماکِ کار، ولولہ، جوش کے ساتھ خلوص و دیانت ہے۔ جو اَنا، سب سے پہلے کہا گیا تھا اس کی بازگشت ہے۔ شعور کی تاریکی میں طلوعِ سحر، زندگی کا فروغ، ہوش کی بیداری، بامقصد کاوش ہے۔ جینے اور جاننے کی تب و تابش ہے۔ اخلاص، دیانت، ایثار اور قربانی کا جذبہ ہے۔ سیرت کی بنیاد ان ہی چار باتوں پر ہے۔ جب یہ پیدا ہو جائیں تو خلق ایسے کو پوجتی ہے۔ اخلاص اور ایمان ایسے میں ہی ہوتا ہے۔ خود دوسروں کے لیے کام کرے۔ اس مقام پر بسم اللہ خلوصِ عمل کی بہار ہے۔ ارتقائے حیات کا نکھار ہے۔ صاحبِ بسم اللہ اسرافیل کا شہسوار ہے۔ انفرادی

خودغرضی سے نکل کر، عالمِ انسانیت کی خاطر، عمل کی راہ کھلنا احسان ہے۔ اس احسان کے بدلے، مرکزِ جمعیت کے ساتھ سچا لگاؤ ہے۔ بڑھتے بڑھتے یہ وفا کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ وفا پر قائم رہنا ہی ایمان کا پہلا قدم ہے۔ بسم اللہ کی یہ توفیق بھی انسانی فطرت میں ہے۔ ایک حد تک یہ ان اقوام کو نصیب ہے جو مخلص ہیں۔ مخلص ہونے کے لیے قوم اور مذہب کی بندش نہیں۔ وہ انہماکِ کار جس میں خلوص ہو، اپنی ذاتی اور انفرادی غرض نہ ہو، جمعیت ہی کی خاطر ہوا کرتا ہے۔ اسلام میں نمازِ باجماعت اسی خلوص کا اظہار ہے، جو افرادِ جمعیت کو ایک دوسرے کے ساتھ ہوتا ہے۔ نماز کا قیام اپنی وفاداری کے قیام کی نشانی ہے۔ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کا نمونہ ہے۔ صلوٰۃ وصل کی والہانہ نسبت کا اظہار ہے۔ وفا پر قیام ایک چاہنے والے ہی کے نصیب میں ہے۔ اسی لیے کہا ہے۔

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

لطیفۂ نفس کی سطح پر بسم اللہ کا دوسرا طبق ہر مذہب کے مخلص کو نصیب ہے۔ مگر مومن کی یہ فوقیت ہے کہ اسے اپنے اندر ہر بسم اللہ کا راز افشا ہونے لگتا ہے۔ مومن کے تخیل اور ایمان کی ظاہری جامعیت، اسے شدّت کے ساتھ مرکز کی طرف رجوع رکھتی ہے اور مرکز بھی کون جو "رَحْمَتَ الِّلعَالَمِیْن" ہے محبوبِ ربّ العالمین ہے۔ "لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاک" کا مصداق ہے۔ محبت و ایمان کی اس روشنی میں ہر فردِ مومن، اپنی جسمانی اور ذہنی زندگی کو بھی قدرت کے ساتھ ساز گار پاتا ہے۔ اس فروغِ کُن کی لذت میں ہر کام کو

انہماک اور شدّت سے محبوب کی خاطر کرتا ہے اور اندرونی احساس یہی ہوتا ہے کہ یہ کام ایک مقصد اور مشیّت کے تحت عطا کردہ باطنی صلاحیتوں کے ذریعہ اس سے کروایا جا رہا ہے۔ اب وہ بڑھتے بڑھتے اس کیفیت میں پہنچ جاتا ہے کہ جو حق کی خوشی وہی اس کی خوشی۔ اس شدّتِ یک رخی میں اس کا یہ حال ہوتا ہے کہ جو تصوّر کیا، وہی ظہور میں آیا۔ یعنی جو چاہے سو ہوتا ہے۔ مگر اسباب کے ساتھ ایمان اس پر اور عمل اپنے ہاتھ میں۔ بسم اللہ کے صحیح معنی بھی یہی ہیں۔ اس عمل کی اسپرٹ میں کتنا فروغ ہے۔ پھر جب جمعیت کی بسم اللہ اس انداز کی ہو جائے، کہ ایمان اس پر اور عمل ہم کریں گے، تو ایسی جمعیت کی بسم اللہ زمانہ پر احسان بن کر چھا جاتی ہے۔ مرکز ایمان پر قلبی لگاؤ اور اس کی اُمّت سے خلوص و محبت کی نسبت اسے انہماکِ کار سے وابستہ رکھتے ہیں۔ جمعیت پر یہ ''رَحْمَتَ اِلّلعَالَمِیْنی'' پرتو اسے لطیفۂ نفس کی منزل اور بسم اللہ کے اس طبق تک اٹھائے رکھتی ہے جو عالمِ انسانی کی عام سطحِ نفس یعنی خودغرضی اور خودپرستی سے بلند ہے۔ یہاں نفسِ مطمئنہ اور نورِ عقل مشعلِ راہ ہے۔ جسم، حواس، تہذیب یافتہ عقل اور خلوص کی کارفرمائی میں اپنے اندر ہر رَبّی کا راز کھلتا ہے۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ اسی حکمِ الٰہی، توفیقِ الٰہی، عطائے الٰہی کے تحت جو ہمارے اندر ہے، اپنے ایمان، خلوص اور انہماکِ کار سے، اپنی قدرتی صلاحیتوں کا دائرۂ عمل کتنا وسیع ہو جاتا ہے۔ لہٰذا فطرتِ انسان میں جاگزیں کی ہوئی یہی بسم اللہ جمعیت اور افراد کی سطح پر اسلام کے فروغ کی محرک قوت بنے گی۔

تیسرا طبق:

بسم اللہ کا تیسرا طبق قلب ہے۔ ق ل ب، زیست کے حروفِ

مقطعات ہیں۔ سرچشمۂ کتابِ معنوی ہیں۔ موصل المطلوب ہیں۔ نردبانِ حسن ہیں۔ براقِ عشق ہیں۔ ق، فرقان کے دو نیناں، ل زلفِ جاناں، ب لبِ محبوب۔ یہاں تخلیق کی اغرشِ مستانہ ہے۔ یہاں شریعت کی منزل ہے، طریقت کا جادہ۔ یہاں حقیقت کا خمِ وحدت ہے، معرفت کی مشکوٰۃِ نور۔ یہاں رندی کا میخانہ ہے، وجدان کا رقصِ مستانہ۔ یہاں منبعِ بسم اللہ سے نسبت کے طفیل مختلف مدارجِ کُن، نفس، لطیفۂ نفس، قلب کی کارفرمائی اپنے دائرہ اختیار میں ہے۔ اب زندگی کے راگ جس سُر میں بھی گائیں، آگ کا فوارہ بن کر چھوٹیں گے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ مومن کی بسم اللہ وصل سے شروع ہوتی ہے۔ مومن کی دنیا قلب کی دنیا ہے۔ یہاں کا ہر عمل خلوصِ نیت اور فریفتگی لیے ہے۔ اس لیے کہ محبوب کے لیے ہے، محبوب کے وسیلے سے ہے۔ یہاں، تخیل ارادے اور عمل میں وہ شدّت ہے کہ اپنا سب کچھ، جان و مال محبوب پر نثار۔ اسی شدّت میں اُمّت اور جملہ کائنات سے حُب کا تعلق، محبوب کے طفیل نصیب ہے۔ یہاں نورِ عقل کی روشنی ہے، عشق مشعلِ راہ ہے۔ اسی لیے ہدایتِ عمل، عقل کی سطح سے نہیں ہے۔ بلکہ اس وجدان کے تحت القاء ہے جو محبوب سے والہانہ لگاؤ کی بناء پر ہے۔ جسم، حواس، عقل، قلب سب کے سب تابع ہو کر عمل پیرا ہیں۔ حیاتِ انسانی کو ایک نیا بانکپن سنوارتا ہے جو نفس اور لطیفۂ نفس کی سطح سے کہیں بلند ہے۔ اس مقام پر ہر شخص، اپنی جسمانی، ذہنی، قلبی، توفیقِ الٰہی کو دیکھتا ہے۔ اور اسی کی روشنی میں اعلیٰ اقدار پر زندگی گذارتا ہے۔ اپنی ''مَیں'' اور عقل کے چکروں سے کبھی کا چھوٹ چکا ہوتا ہے۔ جو حق کی خوشی وہی اس کی خوشی، جو محبوب کا انداز وہی اس کا انداز۔ گویا وجدان کی بہار ہے، شجرِ طیّب کا نکھار ہے، صاحبِ بسم اللہ جبرئیل کا شہسوار ہے۔

قلب کی سطح کی بسم اللہ کا تعلق نیّت سے ہے۔ نیّت میں خلوص ہے تو عمل بھی مقبول۔ نیّت کا خلوص ایک عاشق ہی کو نصیب ہوتا ہے۔ عبادت تک میں شان اسی خلوص کی وجہ سے آ جاتی ہے۔ خلوص کی برکت سے مشیت سے ہم آہنگی ہے۔ مشیت کو دیکھتے ہوئے عمل ہے، اس لیے صالح ہے۔ اور مقدر کی رکاوٹ نہیں۔ عملِ صالح تو بنیادِ عالم کے ساتھ ہم آہنگ ہے اور سنّتِ اللہ ہے، اس لیے رکاوٹ کیسی۔ ایسے کے دل سے نکلا کلمہ، ایسے کی بسم اللہ، حکم کا اثر رکھتی ہے۔ یہ خود ہی کلمۃ الحق کے انداز میں ہوتا ہے۔ جو منہ سے نکلا وہ ہوتا ہے۔ ایک موج سی اٹھتی ہے کہ ہو جا، اور وہی ہو جاتا ہے۔

قلب کی سطح پر جب لطیفۂ نفس کے سہارے بسم اللہ کا نقشہ جمایا جائے اور جب کوئی ہستی سکینتِ قلب میں جامعیت حاصل کر لے، تو اس کے اپنے ایمان اور تخیل کی روشنی اسے یک رخی بخش کر، اس کے تصور کو جلا اور پختگی عطا کرتی ہے۔ تصور میں یک رخی ہوئی اور اپنے دل و جان نے اس تصور کی صداقت کو اپنایا تو جو تصور کیا وہی ہوگا۔ اور جو زمانہ کو رخ دیا وہی ظہور میں آئے گا۔ قلب سے نکلی ہوئی بسم اللہ محرکِ فروغ کی قوت اپنے تاثرات خود زمانے میں پھیلائے گی۔ ایک وقت میں کئی دلوں پر اثر انداز ہو کر انہیں توحیدِ تخیل و عمل بخشے گی اور جو بات مرکزِ جمعیت نے کہی اس کو زمانہ اپنائے گا۔ گویا کہ بحرِ توحید میں قلب کا ملاح، اسم کی کشتی پر سوار ہے۔ رحمانیت کی ہوا چل رہی ہے اور ذات کے کنارے کی طرف گامزن ہے۔

چوتھا طبق:

بسم اللہ کا چوتھا طبق روح ہے۔ یہاں عقل و ارادے اور دل کی چاہ

سے بھی اوپر، امر کی کار فرمائی ہے۔ اسی طرح کہ جیسے اللہ کے ساتھ زندہ و تابندہ تعلق ہے۔ یہاں سیلِ نور، جولاں و تاباں ہے۔ کُن کے مالکوسی راگ کا سوز بے حد و پایان ہے۔ سَرگم امر ہے۔ الاپ رَبّی، میں کا ساز، بہارِ نغمہ حاصل ''کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَان اِلَّا بِاسُلْطَان. کَیْفَ فَبِاَیِّ اَلاءِ رَبِّکُمَاتُکَذِّبٰن'' یہاں نسبتِ محبوب بھی ہے اور اس تعلق کے وجدان کا سروری احساس بھی ہے۔

خود بخود می آید ایں آوازِ دوست

مقدرات کو یار کی چال پر رقص کرتے دیکھنا ہو تو جسم کے چوکھٹے میں سے نکل کر اس چوکھٹ پر آ جائے اور سنے

نے گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
مَیں ہوں اپنی شکست کی آواز

اب صحیح معنوں میں تلاشِ حق شروع ہوتی ہے۔ ارتقائے باطن ہوتا ہے۔ سنتِ ابراہیمی کے توحیدی رنگ کی پیروی ہوتی ہے۔ یہ محبوب کے ساتھ عشق و امر کی توحید ہے۔ پھر مقامِ موسوی سے شرع و قانون، انسانیت کو عطا ہوتا ہے۔ ظاہر میں جلالِ موسوی کی تابانی ہے۔ اور باطن میں علمِ لدنی اور اندازِ حکیمی ہے۔ اس کے بعد مقامِ عیسوی پر نیا رُخ ملتا ہے۔ زندگی کی اعلیٰ اقدار، پروان چڑھتی ہیں۔ عشق کے طفیل محبت ہے، قربانی ہے، مسکینی ہے عاجزی ہے، پھر ان ارتقائی مدارج کے حصول کے بعد جب مقامِ روح پر اٹھایا جاتا ہے تب کہیں صحیح میزانِ انسانیت پر مقامِ محمدی ﷺ میں قدم رکھتا ہے۔ جہاں ظاہر باطن کی توحید ہے۔ نفس، عقل، قلب، روح کی توحید میں حیات ہے۔ یہاں

دنیا کو بھی نبھانا ہے اور دین کو بھی، تجارت بھی کرنی ہے، شادی بھی، محبت بھی، جنگ بھی، قانونِ الٰہی کی پابندی بھی، عشق بھی، نیابتِ الٰہی بھی۔

روح کے مقام پر کُن کے ذریعہ روح میں حیات ملتی ہے۔ روح کا مقام حاصل ہونے کی بات کچھ ایسی ہے کہ جیسے اٹھا لیا گیا۔ اس میں اپنی کوشش کو دخل نہیں۔ ادھر کا کام ہے۔ یہ ''کُنْ فَیَکُوْن'' کی منزل ہے اور صاحبِ امر کے فیضان ہی سے یہاں تک رسائی ہے۔ آسمان پر اٹھا لیا جانا یہی بات ہے۔ یہ امر باللہ ذکرِ باطن کے طفیل، جب روح کو حیات ملتی ہے تو وہ بلندیوں کی طرف صعود کرنا چاہتی ہے۔ ادھر کے کرم سے ہی مقامِ جبروت عطا ہوتا ہے۔ یہ مقام قلب، مقامِ ملائک سے اوپر کی بات ہے۔ جبار وہ جو گلے لگا لے۔ محبوب میں فنا ہو جانے کے طفیل کیا کچھ نصیب نہیں ہوتا۔ عشق ہی سب منازلِ قرب طے کرتا ہے۔ اب دستِ کامل کے طفیل اگر مقدر روشن ہو جائے اور بہ برکتِ بسم اللہ روح الامین کو سینچنا نصیب ہو جائے تو ''کُنْ فَیَکُوْن'' کی چابی مل سکتی ہے۔ روح کے مقام پر کُن تصور کی جلا ہے۔ تصور سے مع جسم کے دوسری جگہ جا سکتے ہیں، اگر بدن میں بھی لطافتِ روح آ جائے۔

انفرادی سطح پر دیکھیں تو روح باعتبار ایک تجرید کے، بدن سے غیرت رکھتی ہے۔ صرف امر کے نفاذ کے لیے یعنی تدبیر و تصرف کے لیے اس سے متعلق ہے۔ بذاتہٖ اپنی بقا اور قیام کے لیے بدن کی محتاج نہیں۔ بدن صرف اس کی صورت ہے۔ بدن کی محتاج ہے بھی تو صرف اسی طور پر کہ عالمِ شہود میں اس کے کمالات کا اظہار، قوائے بدنی پر ہی موقوف ہے۔

عالم میں اس انداز میں وَجْهُ رَبِّكَ ہے۔ اس امرِ ربّی کا بدن میں ایسا ہی جریان ہے جیسا کہ وجودِ مطلق کا موجودات میں۔ ارواح جب کسی صورت

میں مشغول ہوتی ہیں تو وہ اس صورت سے بالذات جدا نہیں ہوسکتیں اور اپنی بساطِ اصل کی طرف نہیں لوٹ سکتیں۔ لیکن وہ یہ طاقت رکھتی ہیں کہ اپنی اصل کو چھوڑے بغیر جس صورت کے ساتھ چاہیں مشکل ہوسکتی ہیں۔ جیسے عالمِ ناسوت میں کسی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا طریقہ اس کو آواز دینا ہے۔ اسی طرح عالمِ ملکوت میں اس کا تصور کرنا ہے۔ نتیجتاً وہ روح بھی متوجہ ہو جاتی ہے۔ ارواح جب کسی چیز کی طرف متوجہ ہوتی ہیں تو اس میں کچھ اس طرح حلول کرتی ہیں کہ اپنے مرکزِ اصل سے جدا نہیں ہوتیں۔ اور اپنی تابانی اس نئے وجود میں دکھاتی ہیں۔ جیسے کہ آفتاب کی روشنی دوسری چیزوں کو منور کرتی ہے اور وہ اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے۔

اعلیٰ طبقات:

جب مرِ بسم اللہ کے طفیل متلاشئی حق روحِ حیوانی کے تسلط سے آزاد ہو جاتا ہے، روحِ ملکوتی یا روح القدس اپنی جانب کھینچتی ہے۔ از سرِ نو بقا ملتی ہے۔ یہ نبوت کا ورثہ ہے۔ جب انانیتِ کبریٰ میں بقا ملتی ہے تو ولایتِ کبریٰ حاصل ہوتی ہے۔ جب دونوں کا جامع ہوتا ہے تو مقام جمع الجمع حاصل ہوتا ہے۔ قلب وجہِ یار کی عکاسی کرتا ہے۔ خود مرِ ربّی بن جاتا ہے۔ یہی مقامِ روح میں قیام ہے۔ روح کا مقام حاصل ہو جائے تو اس کا کیف نصیب ہو۔ یہاں ساری غیریت اٹھ جاتی ہے۔ عذاب ثواب کا یہاں دخل نہیں۔ روح کا عذاب تو بس جدائی ہے۔ اس مقام پر اپنا ہی عکس اس عالم میں نظر آتا ہے۔ کوئی دوئی نہیں رہتی۔ یہ عکسِ وَجْہُ رَبّی ہے۔ یہی باقی رہنے والی چیز ہے۔ روح کو ہلاکت نہیں اس کا وظیفہ عشق کی تکمیل ہے۔ وَجْہُ کا کامل ظہور اپنے اندر

ہے۔ یہ عرفان سے اوپر کی بات ہے۔ یہی اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کے مقام کا کُن ہے۔ اسی کے ذریعہ روحِ اعظم تک رسائی ہے۔

روحِ اعظم سے اوپر ''لَوْلَاکَ لِمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاک'' کی حقیقت ہے۔ یہ محبوبیت کا مقام ہے۔ یہ حقیقتِ محمدی ﷺ کی تابنا کی ہے۔ یہ وہی جھلک ہے جو پہلے کُن کی جھلک تھی۔ حقیقتِ محمدی ﷺ کو اپنانے کے لیے غیب سے ماوراء ھُو میں رسائی ہوتی ہے۔ تب کہیں لولاک کا رمز کھل سکتا ہے۔ اسی کُن سے سب ظہور ہے جس کی جلوہ افشانی تمام آسمانی کتابوں میں ہے۔ قرآن کا نچوڑ کُنْ فَیَکُوْن سمجھنے کی بات ہے۔ اسلام کے فروغ کی محرک قوتِ کُن جمعیت کے انداز میں اسی نسبت محمدی ﷺ کے سہارے ہے۔ انفرادی سطحوں سے ہٹ کر جب روح اعظم کے مقام پر، انوار محمدی ﷺ کی تجلی، جمعیت پر پڑنے لگے تو نئے نقشے جمنے لگتے ہیں۔ جیسے آفتاب کی کرنیں مختلف اجسام کو منوّر کرتی ہیں اسی طرح امرِ ربّی جب جمعیت اور اُمت پر کارفرما ہو تو فروغِ فطرتِ انسانی شروع ہوتا ہے۔ قومِ نفس کے مقام سے اٹھ کر لطیفۂ نفس، قلب، روح کے منازل میں قدم رکھتی چلی جاتی ہے۔

جب باطنِ اُمّت کو حیاتِ روح عطا ہو تو فتح اسلام کیونکر نہ ہو۔ آفتابِ رحمت کی درخشانی میں ہر ذرّہ کیونکر نہ چمک اٹھے۔ عقل کا کام یقین تھا۔ قلب کا کام وجد، روح کا کام، اس وجدان کے تعلق کا سروری احساس۔ اب سر کا کام مشاہدہ ہے۔ خفی، اخفا، راز و نیاز کی باتیں ہیں۔ اور غیب محمل نشینی۔ جن روحوں کا عروج اعلیٰ مقاماتِ سر، خفی، اخفا، غیب کی جانب ہے، ان پر ''رَحْمَتَ الِّلعَالَمِیْنی'' انوار چھا جاتے ہیں۔ پھر ان ہی اجسامِ مطہّرہ کے ذریعہ رحمت کے ان انواروں کی تابانی زمانہ کو نصیب ہوتی رہتی ہے۔ روح کی

سطح پر بسم اللہ کا انداز امر کی شکل میں تھا۔ یہاں کی بسم اللہ کا انداز رحمتِ محمدی ﷺ ہے۔ یہاں کے کُن کی کارفرمائی فکر کے انداز میں ہے۔ رحمت کی شعاعوں کو مرکوز کرنا، ایمان و عمل کے مجموعے سے، توحیدِ فکر ہے۔ یہ تصوّر کے معیار سے بہت بلند اور اعلیٰ مقام ہے۔ حق کی مرضی کے ساتھ حق کی عمل پیرائی اور کارفرمائی ہے۔ وجود اور ذات کے سارے احساناتِ عظیم مادّی، جسمانی، قلبی، روحانی، نوری کو اپنے اندر سمو کر پھر ان کے نشر کا ذریعہ بننا ہے۔ یہی بندگی کی معراج ہے۔ یہی اکملیت کا انداز ہے۔

انسانی زندگی میں ہر سطح کے کُن کی کارفرمائی کو فروغ اسی وقت ہے جب جمعیت کا انداز لیے ہو۔ اسی کے سہارے زمانے کی تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ نفس اور مادّی سطح کا کُن ہی لیں تو دنیاوی سطح پر جو بڑی بڑی تحریکیں کامیاب ہوئیں ان کی عمل پیرائی اسی اجتماعی محرک قوتِ عمل کے سہارے تھے۔ اسلام کے فروغ کی محرک قوت کی عمل پیرائی کم از کم لطیفۂ نفس اور قلب کی سطح سے تھی کہ زمانہ کو ایک نئی روشنی بخشی۔ صاحبانِ کُن نے پسِ پردہ رہ کر ہی اپنے انداز کو جمعیت کی جانب مرکوز کیا تو نقشے بدلنے شروع ہو گئے۔ کیونکہ جب کوئی ہستی سکینتِ قلب میں جامعیت حاصل کر لے اور اس کے اپنے تخیل اور ایمان کی جامعیت جب اُمّت کی سمت یک رخی حاصل کر لے، تو اس کے تصوّر کو جلا اور پختگی عطا ہوتی ہے۔ تصوّر میں شدّت آئی۔ تصوّر میں یک رخی ہوئی اور اپنی دل و جان نے اس تصوّر کی صداقت کو اپنایا تو جو تصوّر کیا وہی ہوگا اور جو زمانہ کو روخ دیا ویسا ہی ہوگا۔ اس کے لیے نہ تقریروں کی ضرورت ہے نہ تحریروں کی، نہ مجاہدوں کی ضرورت ہے نہ ریاضتوں کی۔ یہ متحرک قوّت ایسی پوشیدہ لہروں کے ذریعہ اپنے تاثرات زمانے میں پھیلائے گی کہ کئی دماغوں پر اثر انداز ہو کر

انہیں ایک ہی جیسا تخیل بخشے گی۔ یہ بات افرادِ زمانہ کے دماغوں میں خود جگہ کر لے گی۔ اور جو بات اس صاحبِ کُن اس صاحبِ مقامِ انا اُمّتی مرکزِ جمعیت نے کہی اس کو زمانہ اپنائے گا۔ اور مرکزِ جمعیت کے ساتھ یک رُخی پیدا ہوتی چلی جائے گی۔ یہ کم از کم مقامِ قلب کی بات ہے۔ دل کے آئینے جب مجلّٰی ہوں، جب اُمّت کا دردان مصفّٰی قلوب میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہو تو ان کی اندازِ فکر جدا جدا نہیں ہو سکتی۔ سب یار ہی کے آئینے میں اُمّت محبوب ﷺ کو دیکھ رہے ہوں گے۔ اس لیے تمام فقرا کا اندازِ فکر ایک ہی ہوگا۔ تمام صاحبانِ دل، صاحبانِ کُن ایک توحیدِ فکر ونظر میں ہونگے۔ مگر یہ نفس، لطیفہ نفس، اور قلب کی منازل بھی سب سے نچلی سطح کی باتیں ہیں۔ جسے حیاتِ انسانی کہتے ہیں اسلام کا ابتدائی قدم ہے۔ اس کی منزل تو رحمت ومحبوبیت ہے، جس کے انوار زمانے میں پھیلے ہیں۔ ان انوار کو اپنانا، ان انوار کو اپنے اندر سمونا اور نشر کرنا فقرا کا کام تھا۔ انفرادی حد تک یہ بہت کچھ کیا گیا۔ لیکن جمعیت کی سطح پر ان انوار کو پہنچانے والے کم ہی آئے۔ یہاں تک کسی کسی کی ہی نظر گئی۔ اور سینوں کا راز سینوں میں ہی رہ گیا۔ اسلام کی شان، اس تابانی کو کبھی نہ کبھی تو زمانے میں پھیلنا ہے۔ کُن کا یہ امر نہ اور کسی قوم کو نصیب ہے نہ کسی دوسری آسمانی کتاب کو۔ اسلام کی حقیقت کو تو مفکرین نے پیش کیا مگر اس محرک قوتِ کُن کو جو اسے بہ فیضِ نسبتِ محمدی ﷺ نصیب تھی نہ کسی نے بیان کرنے کی کوشش کی نہ اسے میراثِ نبوت سمجھا۔ مادی نفس اور لطیفہ نفس کی سطحوں پر قومی اصلاح کے لیے سر توڑ کوششیں کیں، مگر ان باطنی خزینوں، باطنی راستوں کے ذریعہ قلوب اور روحوں تک رسائی نہ کی جہاں کی کنجی کُنْ فَیَکُوْنْ تھی۔ اصلاحِ قلب اور تزکیہ باطن ہو جاتا تو اعمالِ حَسَنہ خود پھوٹ پڑتے۔ قلب کو منوّر کرنے کے لیے اسی

سطح کے کُن کی ضرورت تھی۔ جو سینوں میں عشقِ رسول ﷺ کی دبی ہوئی آگ کو بھڑکا دیتا۔ تالیفِ قلوب کا تعلق تو صرف دل کی چاہ سے ہے۔ فقر کی میراث کا یہ پہلا قدم ہے۔ اُمت کے دُکھ درد کو ہر شے، ہر معراج سے، عزیز تر جاننے کی تڑپ ہے۔ شریعتِ نبوی ﷺ کی اولین بنیاد ہے۔ یہ عشق و محبت و قلب کی دنیا ہے۔ اس کا تعلق ہاتھ پیر کی حرکت سے ہے، نہ عقل و استدلال سے، نہ پند و نصائح سے۔ یہاں کا عمل دل کی چاہ ہے۔ اُمّت کے لیے آنسو بہانا ہے۔ اُمّت کے غم کو غمِ جاناں بنانا ہے۔ عشقِ محبوب میں بس کر اس کی سنّت کی اس خوشبو کو عام کرنا ہے۔ محبوب کے والہانہ لگاؤ کے طفیل جب مقامِ امر، مقامِ روح میں دسترس ہو تو، امر باللہ کا اجراء ایسے ہی عارفین کے دائرہ امکان میں ہے۔ اور اس کے اوپر کی منازل میں۔ ان ہی منتخبین اُمّت کو، رحمتوں کے انوار اپنے اندر سمو کر، رحمت کا نشر کرنا ہے۔ المختصر مصلحین کے عمل کا طریقۂ کار، ہر سطح کے مطابق ہونا ہے۔ مادی اور نفس کی سطح پر اجتماعی کوششِ جسمانی، اور عقل کو فروغ دینا ہے تو لطیفۂ نفس پر خلوصِ عمل، اور قلب کے مقام پر محبت کی کارفرمائی۔ اس طرح منزل بہ منزل ارتقائی مدارج طے کراتے ہوئے، جمعیت کی زندگی میں ہر سطح کی بسم اللہ کی عمل پیرائی کرانی ہے۔ ارتقاء کی چال، صبر آزما اور مدھم ضرور ہوتی ہے مگر یہی تو فطرتِ انسانی کے عین مطابق بات ہے۔ عشقِ مرکز کے طفیل، تزکیۂ باطن ہو جانے کے بعد ہی اُمّت کی رسائی، اس کے ابتدائی مقام، مقامِ روح، مقامِ امر تک ہوتی ہے۔ اور افراد کو ہی نہیں بلکہ اجتماعی زندگی میں جمعیت کو کُن کے مختلف مدارج کی کارفرمائی اپنی حیات میں دیکھ لیتی ہے۔ لہٰذا ظاہر داری سے ارکانِ دین کی ادائیگی کے علاوہ بھی اُمّت کو، جانِ دین، جانِ اسلام کی طرف قدم اٹھانے ہیں۔ فروغِ اسلام کی فطری پوشیدہ

قوتوں کو جمعیت کی روز مرہ زندگی میں کارفرما کرنا ہے۔ یہ ان رحمتوں کے وسیلوں کے تحت ہی ممکن ہو سکے گا جو فقراء کو نصیب ہیں۔ یہ کام نہ دشوار ہے نہ ناممکن۔ ان مصلحین کو اپنی زندگیوں، اپنی ریاضتوں، اپنی عبادتوں کو اُمّت اور صرف اُمّت کی خاطر ہی وقف کر دینا ہے۔ اور اپنے میں وہی شدّت لانا ہے جو سنت محمدی ﷺ ہے۔ یعنی اُمّتی اُمّتی کی فریاد۔ فقراء میں اگر یہ توحیدِ فکر آ جائے تو ان منازلِ قرب کے وسیلے سے جو اُمّت کے خواص کو نصیب ہیں، کیا کچھ اُمّت کے کام نہیں بن سکیں گے۔ کیونکہ اسی توحیدِ فکر میں ان کی ساری صلاحیتوں کو وہی شدّت اور یک رخی حاصل ہوگی وہی دامنِ رحمت بن کر اچھے بُرے سب اُمّتیوں کو کملی میں ڈھانپ لے گی۔ عشقِ رسول ہی ہر اُمّتی کی میراث ہے۔ اسی لیے ان رحمتوں کے انوار میں اس اُمّت کے آٹھوں طبق روشن ہو جائیں گے۔

❁❁❁❁